قرآن کا تصوّرِ انسان

نعمان نیئر کلاچوی

قرآن کا تصوّرِ انسان

نعمان نیئر کلاچوی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام مقالہ	قرآن کا تصوّرِ انسان
مصنف	نعمان نیئر کلاچوی
ناشر	مرشد پبلی کیشنز، کلاچی، ڈیرہ اسماعیل خان
پی ڈی ایف ایڈیشن	اپریل، 2026

فہرست

نمبر	عنوانات	صفحہ
1	پیش گفتار	5
2	انسان کی خلقتِ اوّل (مادہ)	10
3	انسان کی خلقتِ عام (حیات)	17
4	شعورِ عام (عقل)	23
5	شعورِ خاص (اخلاقی حِس)	28
6	اِرادہ واختیار (قوّتِ عمل)	33
7	مقصدِ حیات	36
8	قرآن کا انسانی ماڈل	45
9	دیگر معروف انسانی ماڈل	50

پیش گفتار

مادہ(Matter)، حیات(Life) اور شعور(Consciousness) کے فہم نے فلسفہ(Philosophy) پیدا کیا۔ انسانی جذبہ اور رویے کی کھوج نے علم النفس (Psychology)پیدا کیا۔مادہ، حیات اور شعور پر غور و فکر سے دو مستقل مدارسِ فکر(Schools of Thought)پیدا ہوئے یعنی مادیت(Materialism)اور مثالیت(Idealism)۔ مادہ پرست کہتے ہیں کہ انسان صرف ایک المناک حادثہ (Tragic Incident) ہے اور یہاں اخلاقیات، جمالیات، جذبات اور خیر کی طلب کوئی معانی نہیں رکھتے اور انسان کو صرف اپنی بنیادی ضروریات پر توجہ دینی چاہیئے۔ یہ مدرسہِ فکر معروف یونانی فلسفی ارسطو(Aristotle)کا ہے۔

اِس کے بر عکس ارسطو کے اُستاد اور منظم فلسفیانہ نظم کے بانی افلاطون(Plato)کا کہنا ہے کہ انسان صرف ایک خالص ذہن (Mind) ہے اور یہ مادہ فریبِ محض (Absolute Delusion) ہے یعنی اِس مادی دنیا میں جو کچھ ہم دیکھتے ہیں وہ اصل نہیں بلکہ اصل کا عکس ہے۔ اپنی اِس فکر کو افلاطون ایک تمثیل سے تعبیر کرتے ہیں جسے فلسفے کی دنیا میں تمثیلِ غار(Allegory of the Cave)کہا جاتا ہے۔یعنی تصوّر کریں کہ کچھ قیدی ایک اندھیری غار میں پیدائشی طور پر بند ہیں۔

اُن کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں اور وہ مڑ کر پیچھے نہیں دیکھ سکتے، صرف سامنے کی دیوار دیکھ سکتے ہیں۔ اُن کے پیچھے ایک آگ جل رہی ہے۔ آگ اور اُن قیدیوں کے درمیان ایک راستہ ہے جہاں سے لوگ مختلف چیزیں (مثلاً جانوروں کے مجسمے، برتن وغیرہ) لے کر گزرتے ہیں۔ جب لوگ اُن چیزوں کو لے کر گزرتے ہیں تو آگ کی روشنی کی وجہ سے اُن چیزوں کے سائے سامنے والی دیوار پر پڑتے ہیں۔ قیدیوں نے زندگی میں کبھی اصل چیزیں نہیں دیکھیں اِس لئے وہ اِن سایوں کو ہی "حقیقت" سمجھ لیتے ہیں۔ وہ اِن سایوں کو نام دیتے ہیں اور اِن کے بارے میں بحث کرتے ہیں کیونکہ اِن کیلئے یہی اِن کی کل کائنات ہے۔

افلاطون کہتا ہے کہ یہ دنیا اور اِس میں موجود تمام اشیاء دراصل حقیقت نہیں بلکہ حقیقت کا پَرتو (Shadow) ہیں اور اصل عالَمِ اَمثال یعنی یونانی زبان میں Edios اور انگریزی میں World of Forms ہے۔ مادہ اور حیات کے بارے میں معلوم تاریخ کی سب سے اہم ترین اور منظم فکر یہی ہے۔ اب اِس کے بعد جو کچھ ہے وہ اِسی فکر کا اصلی خوشہ چین ہے۔

چونکہ یہاں پر مَیں فلسفے کا خلاصہ نہیں بیان کر رہا ہے اِس لئے مَیں افلاطون کی اِس فکر کو یہیں چھوڑ کر آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ افلاطون کے بعد مادہ، حیات

اور شعور کی کھوج پر فلسفے کی دنیا میں ایک طویل عرصے یعنی کم و بیش دو ہزار سال تک مرگِ تام طاری رہی، کہ پھر سترھویں صدی عیسوی میں ڈیکارٹ، پھر کانٹ، ہیوم، ہیگل، مارکس، سارن کیرکیگارڈ، نطشے، سارتر اور کامیو نے مادہ اور شعور پر اپنی اپنی فکر دنیا کے سامنے پیش کی۔

اب یہاں پر مَیں اگر افلاطون، ارسطو اور دیگر اہم فلاسفہ کے افکار کا خلاصہ بیان کروں تو وہ صرف دو ہی صورتوں میں سامنے آئے گا۔ ایک افلاطون کی فکر کہ انسان ایک ذہن ہے اور جب تک انسان غور و فکر کی روش نہیں اپنائے گا وہ صحیح معنوں میں انسان نہیں بن پائے گا اور یہی غور و فکر انسان کی زندگی کا اصل مقصد ہے جبکہ ارسطو کے نزدیک انسان ایک حیوانِ ناطق (Rational Animal) ہے اور جب تک وہ اپنی عقل (Logos) کو مادی ضرورتوں کی تکمیل کیلئے استعمال کرتا رہے گا تو وہ انسان کہلاتا رہے گا یعنی انسانی زندگی کا مقصد حصولِ مسرّت ہے جسے ارسطو اپنی خاص یونانی اصطلاح میں Eudaimonia کہتا ہے جبکہ انگریزی میں اِسے عموماً Hedonism کہا جاتا ہے۔

پس یہی دو فکری مدارس فلسفے کی پوری تاریخ میں انسانی غور و فکر کا کُل ماحصل ٹھہرے۔ لیکن کیا واقعی بس یہی دو مقاصد ہی انسان کا مقدر ہیں یا کہیں کوئی اور

مقصد بھی انسان کے پاس رہا ہے ؟، تو اِس کا جواب ہے ہاں، کیونکہ اِن دو مدارسِ فکر کے علاوہ ایک تیسری منظم فکر بھی موجود رہی ہے اور اُس کا مآخذ انبیاء کرام علیہم السلام کی خبر یعنی وحی ہے۔ چنانچہ انسان کی پیدائش سے لیکر قریباً ہر زمانے میں انسانی معاشروں میں کچھ لوگ ایسے کھڑے ہوتے رہے اور جو دعویٰ کرتے رہے کہ انسان کی اصل اور اُس کی زندگی کے مقاصدِ اصلی ہمارے پاس ہیں، ہماری فکر سنو اور سمجھو اور اِس پر عمل کرو کیونکہ یہ ہماری اپنی فکر نہیں بلکہ یہ ہمیں اِس کائنات کے قادر مطلق خدا نے عطاء کی ہے۔

یاد رہے کہ انبیاء فلسفی اور صوفی نہیں ہوتے بلکہ وہ ایک عام لیکن باکردار انسان ہوتے ہیں اور جو کچھ وہ بیان کرتے ہیں فلاسفہ اور صوفیاء کی طرح اُسے اپنے تدبّر یا وجدان کا کمال نہیں کہتے بلکہ اُسے عطیہِ خداوندی کہتے ہیں۔ پس انبیاء کی تاریخ میں یہ بات مسلّم ہے کہ کوئی بھی نبی باقاعدہ فلسفہ و تصوّف کا طالبعلم اور رسمی تعلیم کا حامل نہیں رہا۔ نبی ہو یا رسول ایک عام انسان ہوتا ہے اور پورا معاشرہ اُس کی مکمل شخصیت سے واقف ہوتا ہے۔ نبی اور رسول عام انسان ہونے کے باوجود بھی اعلیٰ ترین کردار کا حامل ہوتا ہے اور پورا معاشرہ خود اُس کے کردار کا گواہ ہوتا ہے چنانچہ جب وہ کوئی فکر اِس بنیاد پر پیش کرتا ہے کہ یہ فکر میری نہیں بلکہ خدا قادر مطلق کی طرف سے ہے تو لوگ اُس کے سابقہ کردار کے ہاتھوں مجبور ہو کر اُسے کم از کم

جھوٹا نہیں کہہ پاتے۔ چنانچہ نبی یا رسول جو فکر پیش کرتا ہے، مخاطبین یا تو اُسے بغیر کسی دلیل کے رَد کر دیتے ہیں یا پھر اُسے کافی دلائل کی بنیاد پر تسلیم کر لیتے ہیں۔ انبیاء کی یہ فکر نہ تو افلاطونی فلسفہ ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی سائنسی تھیوری بلکہ مادہ، حیات اور شعور کے متعلق وہ ناقابلِ تردید حقائق کا بیان ہوتا ہے کہ انسانی عقل ایسے حقائق محض اپنے تخیل یا فکر سے نہیں پیدا کر سکتی۔

پس آپ اگر آج تمام معتبر فلاسفہ اور صوفیاء کا تصوّرِ انسان اور پھر آخری رسول حضرت محمد ابن عبد اللہ ﷺ کا پیش کردہ تصوّرِ انسان پرکھیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اِس معاملے میں رسول کی فکر یعنی قرآن ایک ایسے مقام پر کھڑا ہے کہ جس پر یقین کئے بغیر کوئی سلیم الفطرت انسان رہ ہی نہیں سکتا۔ یہ میرا ذاتی تجربہ تو خیر ہے ہی لیکن آئندہ صفحات میں اِس حقیقت کا انتظام مَیں اب اپنے مخاطبین کیلئے بھی کر رہا ہوں تاکہ میرے قابل مخاطبین خود پرکھ سکیں کہ قرآن کا انسان کون ہے اور فلسفیوں اور صوفیوں کا پیش کردہ انسان کون ہے۔ شرط بس اتنی سی ہے کہ میرا یہ مقالہ پڑھنے سے قبل آپ اپنے سابقہ تمام تصوّرات تکیہ کے نیچے رکھ لیں۔

فقیر

نعمان نیرّ کلاچوی 16 اپریل 2026ء

انسان کی خلقتِ اوّل (مادہ)

قرآن کے تصوّرِ انسان پر غور کرنے سے قبل آپ کو پہلے قرآن کے خدا کو جو درحقیقت اِس کائنات کا قادر مطلق خدا ہے، دریافت کرنا پڑے گا ورنہ میرے یہ تمام الفاظ آپ پڑھ تو لیں گے لیکن دل و دماغ اِنہیں قبول کرنے سے عاجز رہیں گے۔ قرآن کا خدا کیسے دریافت کیا جاتا ہے، اِس کیلئے میرا مقالہ "خدا کی معرفت" کا مطالعہ مفید رہے گا۔ علاوہ ازیں آپ خود بھی غور و فکر کے ذریعے اِس کائنات کے خالق کو دریافت کرسکتے ہیں۔ قرآن کا خدا جب انسان کی تخلیق کی بات کرتا ہے تو وہ اِسے ہر زمانے کے انسان کیلئے ایسے سادہ پیرایے میں رکھ دیتا ہے کہ اگر دنیا ایک بار پھر پتھر کے دَور میں چلی جائے اور انسان کے پاس صرف شعور کے علاوہ کچھ بھی باقی نہ رہے تو بھی انسان اپنی تخلیق کی نہایت صاف اور سادہ کہانی کو بغیر کسی دِقّتِ فکر کے سمجھ سکتا ہے۔ اِس کے برعکس اگر انسان موجودہ دَور کی طرح جدید حیاتیات کے تار و پود بکھیر کر رکھ دے تو بھی انسان کی خلقتِ اوّل کوئی مضحکہ خیز افسانہ نہ بن سکے۔ قرآن دنیا کی واحد کتاب ہے جس کا اصلی موضوع انسان اور اُس کی کردار سازی (Character Building) ہے۔ چنانچہ قرآن میں لفظ انسان 65 مقامات پر آیا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ انسان پر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ یہ وجود سے بالکل محروم تھا۔

هَلْ أَتَىٰ عَلَى الْإِنسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُن شَيْئًا مَّذْكُورًا۔

کیاانسان پر ایک ایساوقت نہیں آیا کہ یہ کوئی قابلِ ذکر شے نہیں تھا؟۔

(سورہ الاِنسان۔ آیت 1)

یعنی انسان اِس کائنات کا مرکز نہیں بلکہ اِس کائنات کے خالق کی ایک بامقصد تخلیق ہے ورنہ کائنات کے آغاز کے ساتھ ہی انسان بھی واقع ہو جاتا۔ دلچسپ اَمر یہ ہے کہ آج انسان کی اِس حقیقت کو جدید طبیعیات نے بھی واضح کر دیا کہ انسان بہر حال کائنات کا مرکز نہیں ہے۔ بہر حال اب قرآن کا وہ نہایت سادہ اعلان سن لیں کہ انسان پہلی بار کیسے وجود میں آیا۔

إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ ۖ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُن فَيَكُونُ۔

بے شک عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی سی ہے، اُسے مٹی سے پیدا کیا، پھر اُسے کہا کہ ہو جا تو پھر ہو گیا۔ (سورہ آلِ عمران۔ آیت 59)

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن طِينٍ۔

اللہ وہی ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا۔ (سورہ الاَنعام۔ آیت 2)

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ۔

اور بات یہ ہے کہ ہم نے انسان کو سڑے ہوئے گارے سے پیدا کیا۔

(سورہ الحجر۔ آیت 26)

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ۔

اور بات یہ ہے کہ ہم نے انسان کو مٹی کے نچوڑ سے پیدا کیا۔

(دورہ المؤمنون۔ آیت 12)

الَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ ۖ وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنسَانِ مِن طِينٍ۔

وہ اللہ جس نے ہر چیز کو حُسنِ خَلق سے نوازا اور انسان کی ابتداء مٹی سے کی۔

(سورہ السجدہ۔ آیت 7)

فَاسْتَفْتِهِمْ أَهُمْ أَشَدُّ خَلْقًا أَم مَّنْ خَلَقْنَا ۚ إِنَّا خَلَقْنَاهُم مِّن طِينٍ لَّازِبٍ۔

پس اب اِن سے پوچھو کہ کہ اِن کی پیدائش زیادہ مشکل ہے یا اُن چیزوں کی جو ہم نے پیدا کر رکھی ہیں، اِنہیں تو ہم نے لیس دار مٹی سے پیدا کیا۔

(سورہ الصّٰفّٰت۔ آیت 11)

إِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا مِّن طِينٍ۔

جب تیرے ربّ نے فرشتوں سے کہا کہ مَیں ایک انسان مٹی سے بنانے والا ہوں۔

(سورہ ص۔ آیت 71)

خَلَقَ الْإِنسَانَ مِن صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ۔

انسان کو سوکھی کھنکتی مٹی سے پیدا کیا گیا۔(سورہ الرحمٰن۔ آیت 14)

درج بالا آیات سے ایک نکتہ تو بالکل واضح ہو چکا کہ انسان کی خلقتِ اصلی میں اساسی جوہر مٹی ہے۔ سوال یہ ہے کہ قرآن کی اِس خبر میں آخر وہ اُلجھن ہی کیا ہے جو یقین پیدا کرنے سے روک رہی ہے؟، کوئی بھی نہیں سوائے تعصّب کے اور تعصّب کا علاج تو نہ افلاطون کے پاس ہے اور نہ ہی جالینوس (Galen) کے پاس۔

دیکھیں قرآن یہ بھی تو کہہ سکتا تھا کہ انسان کو ریت سے پیدا کیا گیا ہے اور میرے خیال میں یہ زیادہ قرینِ فہم تھا کہ قرآن جہاں نازل کیا گیا وہ لوگ دن رات اِسی ریت میں گزار رہے تھے لیکن نہیں قرآن نے وہ خبر دی کہ جس کی تصدیق کسی نہ کسی صورت میں آج کا علم الحیات (Biology) بھی کر دیتا ہے۔ پس جدید حیاتیات تسلیم کرتی ہے کہ زندگی کی ابتداء کیلئے ضروری عناصر یعنی کاربن، ہائیڈروجن اور نائٹروجن وغیرہ زمین کی مٹی میں موجود تھے۔ ارتقائی عمل سے پہلے

ایک "کیمیائی عمل" ہوا جس میں مٹی کے اندر موجود معدنیات نے زندگی کے ابتدائی مالیکیولز یعنی Amino Acids بنانے میں مدد دی۔ اِس تناظر میں مٹی سے تخلیق اور حیاتیاتی ارتقاء ایک دوسرے کی ضد نہیں بلکہ ایک ہی سلسلے کی مختلف کڑیاں معلوم ہوتی ہیں۔ بات یہ ہے کہ آج کوئی بھی باشعور انسان انسانی وجود میں حیاتیاتی اور شعوری ارتقاء کا مخالف نہیں ہو سکتا کہ یہ تو ہمارے روز کا مشاہدہ و تجربہ ہے کہ ہم روز انسان کو بنتا اور نمو پاتا ہوا دیکھ رہے ہیں، پس اب اگر یہی صورتحال خدا نے انسان کے مادہ کو تخلیق کرنے کے بعد ایک وقت تک جاری رکھ دی ہو تو آخر اِس میں اُلجھن ہی کیا ہے؟۔ لیکن یہ کہنا کہ انسان تخلیق نہیں بلکہ ارتقاءِ محض (Absolute Evolution) کا نتیجہ ہے تو پھر کہنے والوں کو یہ ثابت بھی کرنا ہو گا نہ کہ مفروضات بنا کر اپنی مرضی کا نتیجہ نکالنے سے تخلیق کی نفی ہو جائے گی۔

سوال یہ ہے کہ آخر وہ کونسی شے ہے اِس کائنات میں جو بغیر کسی محرکِ اوّل (Prime Mover) کے خود بخود بنتی چلی جارہی ہے؟، یقین کریں کوئی ایک شے بھی آج تک ایسی دریافت نہ ہو سکی جو خود بخود بنتی چلی جارہی ہو، تو پھر اب بتائیے کہ انسان کیسے خود بخود بنتا چلا گیا؟۔ یہاں پر آپ حیاتیاتی ماڈل قدرتی انتخاب (Natural Selection) کا سہارا لے سکتے ہیں لیکن اپنے لفظ "انتخاب" پر بھی ذرا غور کرلیں کہ یہ لفظ چیخ چیخ کر پُکار رہا ہے کہ یہاں شعوری فیصلہ موجود ہے۔

علاوہ ازیں انگریزی میں Selection اور اُردو میں انتخاب کا مطلب ہی یہی ہے کہ بہت سارے عوامل میں سے کسی ایک عمل کو کسی خاص مقصد کے تحت قبول کر لیا جائے اور باقی کو رَد کر دیا جائے جبکہ یہ عمل بذاتِ خود شعور کا متقاضی ہے ورنہ انتخاب ممکن ہی نہیں۔

بالفرض اگر آج معروفِ زمانہ پینٹنگ "Guernica" باشعور ہو کر اپنے وجود کے متعلق حقیقی معلومات دریافت کرنے کی کوشش کرے تو بتایئے کیا وہ یہ کام خود سے کر سکتی ہے؟، یقیناً نہیں کیونکہ کسی پینٹنگ کے باشعور ہونے سے وہ اپنی اصلیت نہیں جان سکتی اِلّا یہ کہ کوئی قابلِ اعتماد انسان اُسے یہ بتا دے کہ تجھے تو معروف ہسپانوی مصوّر پبلو پکاسو نے 1937ء میں تخلیق کیا تھا۔

ناقابلِ تردید سچ تو یہ ہے کہ اِس وقت انسان اپنی خلقتِ اوّل کے متعلق کوئی بھی مشاہداتی و تجرباتی معلومات نہیں رکھتا اور اِس وقت کیوں، یہ کام تو سرے سے انسان کے کرنے کا ہے ہی نہیں اور نہ ہی انسان کبھی کر پائے گا کیونکہ کوئی بھی شے جب تک اپنی خالق خود نہ ہو، صرف خبر کے علاوہ کسی صورت نہیں جان سکتی کہ اُس کا خالق کون ہے اور وہ کیوں پیدا کی گئی ہے۔ سمجھنے کیلئے یہ کس قدر دوٹوک اور صاف نکتہ ہے لیکن پھر بھی انسان بضد ہے کہ نہیں، وہ تو بہرحال جان کر رہے گا کہ

وہ کیسے بنا اور کیوں بنا جبکہ کیوں کا تو جواب طبیعیات و حیاتیات (Physics and Biology) کے پاس ہے ہی نہیں، رہا کیسے کا معاملہ تو مزے کی بات یہ ہے کہ اِس معاملے میں بھی طبیعیات و حیاتیات کے پاس سوائے تھیوریاں پیش کرنے کے، کچھ بھی نہیں۔ حالانکہ طبیعیات اپنا مقدمہ مشاہدہ و تجربہ سے شروع کرتی ہے لیکن نتائج منطقی مفروضات کی صورت میں سامنے رکھ دیتی ہے کہ چلو فی الحال اِسی پر یقین کرلو، ہم لگے ہوئے ہیں، کچھ نیا آگیا تو یقین بدل لینا۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ طبیعیات اور حیاتیات اپنے ہر نتیجہ کا باقاعدہ مشاہدہ و تجربہ کرواتی رہتی لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔

انسان کی خلقتِ اوّل کے متعلق قرآن یہ خبر دے رہا ہے کہ خدا تعالیٰ نے انسان کو مٹی سے پیدا کیا یعنی انسان کا اصلی مادہ مٹی سے نمو پذیر (Develop) ہوا اور انسان کی یہ پیدائش باقاعدہ ایک مقصد کے تحت کی گئی۔ اپنے مقام پر اِس کی تفصیل بھی آ جائے گی۔ فی الحال یہ دیکھنا ہے کہ قرآن انسان کی خلقتِ عام یعنی وہ انسان جو ہر روز ہمارے سامنے پیدا ہو رہا ہے اُس کے متعلق کیا کہتا ہے۔

☆☆☆☆☆

انسان کی خلقتِ عام (حیات)

انسان کی ایک تخلیق تو وہ ہے کہ جو انسان کے جوہرِ اصلی یعنی مادہ کو واضح کرتی ہے جب خدا تعالیٰ نے انسان نامی مخلوق کو خلق کیا تھا جبکہ دوسری خلقت ہے وہ ہے جس کا ہم اب ہر روز مشاہدہ و تجربہ کر رہے ہیں۔ انسان کی اِس خلقت سے نہ صرف ہم خود گزر کر آتے ہیں بلکہ ہمارا وجود ہی اِس خلقت کا ایک طرح سے عینی شاہد بن جاتا ہے۔ آیئے ذرا قرآن کی طرف مخاطب ہو کر سمجھیں کہ انسان کی یہ خلقت کیسے نمو پذیر ہوتی ہے۔

إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ۔

ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا۔ (سورہ الِانسان۔ آیت 2)

عربی زبان میں نُطفِ امشاج مِلے جُلے قطرے کو کہتے ہیں۔ عربی میں نَطَفَ الماء کا مطلب ہوتا ہے پانی کا قطرہ۔ یوں نفطِ امشاج کا مطلب ہوا مِلا جُلا قطرہ یعنی انسان کے مادہِ تولید (Semen) کا ایک مِلا جُلا قطرہ۔ نفطِ امشاج کی وضاحت ایک اور آیت میں بھی آگئی ہے۔

أَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّن مَّنِيٍّ يُمْنَىٰ۔

کیاوہ ٹپکتی مَنی کا ایک قطرہ نہ تھا؟۔(سورہ القیامہ۔ آیت 37)

دلچسپ بات یہ ہے کہ انسان آج سے چودہ سو سال پہلے صرف اتنا جانتا تھا کہ یہ مَنی ہی ہے کہ جو انسان کی تخلیق کا سبب بنتی ہے لیکن تب قرآنی لفظ "امشاج" وضاحت طلب تھا کہ آخر اِس سے مراد کیا ہو سکتی ہے اور تب تو شاید انسان یہ سمجھ چکا ہو کہ اِس سے مراد مرد اور عورت کے مادہِ تولید کا ملاپ ہے مگر آج تو علم الحیات نے باقاعدہ مشاہدات سے نطفہِ امشاج کو ثابت کر دیا۔ چنانچہ جدید حیاتیاتی سائنس کی رُو سے انسانی زندگی کا آغاز اُس وقت ہوتا ہے جب مرد کا جرثومہ (Sperm) اور عورت کا بیضہ (Ovum) ملتے ہیں اور اِس ملاپ کے نتیجے میں جو پہلا واحد خلیہ بنتا ہے اُسے Zygote کہا جاتا ہے۔

آیت میں "نُطفہ" کو "امشاج" (ملا ہوا) کہنا اُس سائنسی حقیقت کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تخلیق کسی ایک عنصر سے نہیں بلکہ دو الگ الگ اجزاء کے باہمی اختلاط سے ہوئی ہے۔ علاوہ ازیں لفظ "امشاج" صرف دو سیال مادوں کے ملاپ تک محدود نہیں بلکہ یہ اُن کے اندر موجود خصوصیات کے ملاپ کی بھی عکاسی کرتا ہے۔

جدید جینیات (Genetics) بتاتی ہے کہ زائیگوٹ میں مرد اور عورت دونوں کے کروموسومز اور جینز باہم خلط ملط ہوتے ہیں جو بچے کی رنگت، قد، ذہانت اور دیگر

موروثی اوصاف کا تعین کرتے ہیں۔ فلہٰذا "امشاج" کا مفہوم اِن تمام پیچیدہ آمیزشوں پر پورا اُترتا ہے۔

انسان کی خلقتِ عام کے متعلق قرآن صرف یہاں تک معلومات نہیں دیتا بلکہ یہ اِس سے آگے کی بھی معلومات دیتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِن مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ۚ

اے لوگو اگر تمہیں دوبارہ زندہ ہونے میں شک ہے تو (غور کرو کہ) ہم نے تمہیں مٹی سے پھر قطرہ سے پھر جمے ہوئے خون سے پھر گوشت کی بوٹی نقشہ بنی ہوئی اور بغیر نقشہ بنی ہوئی سے بنایا تاکہ ہم تمہارے سامنے ظاہر کر دیں۔

(سورہ الحج۔ آیت 5)

قرآنِ کریم کی مذکورہ آیت اُن مقامات میں سے ہے جہاں انسانی تخلیق کے مراحل کو انتہائی جامع اور ترتیب وار بیان کیا گیا ہے۔ جدید جنینیات (Embryology) کے مطالعے سے جب ہم اِس آیت کا موازنہ کرتے ہیں تو کئی حیرت انگیز مماثلتیں سامنے آتی ہیں۔

1. نُطْفَة (Nutfa):

جدید سائنس کی اصطلاح میں اسے Zygote کہا جا سکتا ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے جب مردانہ جرثومہ (Sperm) اور زنانہ بیضہ (Ovum) مل کر ایک اکائی بناتے ہیں۔ "نطفہ" کا لفظی مطلب 'قطرہ' یا 'تھوڑی سی مقدار' ہے جو اُس مائع کی نمائندگی کرتا ہے جس میں جینیاتی مواد موجود ہوتا ہے۔

2. عَلَقَة (Alaqah):

لفظ "علقہ" کے تین عربی معانی ہیں اور یہ تینوں ہی جنین (Embryo) کی ابتدائی حالت پر صادق آتے ہیں۔

جونک (Leech): ابتدائی مرحلے میں جنین جونک سے مشابہ ہوتا ہے اور اِسی طرح ماں کے رحم سے لپٹ کر غذاء حاصل کرتا ہے۔

معلّق چیز (Suspended Thing): اِس مرحلے پر جنین رحمِ مادر کی دیوار سے لٹکا ہوا (Suspended) ہوتا ہے۔

خون کا لوتھڑا (Blood Clot): اِس مرحلے پر خون کی نالیاں بننا شروع ہوتی ہیں اور بیرونی وضع ایک منجمد خون کے دھبے جیسی ہوتی ہے۔

3.مُضْغَة (Mudghah):

اِس کا مطلب ہے "چبایا ہوا گوشت"۔ جب حمل تقریباً 24 سے 26 دن کا ہوتا ہے تو جنین پر چھوٹے چھوٹے اُبھار (Somites) بن جاتے ہیں جو بالکل ایسے لگتے ہیں کہ جیسے کسی نرم چیز کو دانتوں سے چبایا گیا ہو۔ حیاتیاتی سائنس اِسے ایک خاص اصطلاح Somite Stage سے تعبیر کرتی ہے۔

4.مُخَلَّقَة و غَيْرِ مُخَلَّقَة (Formed and Unformed):

یہ نکتہ سائنسی اعتبار سے انتہائی اہم ہے۔ اِس مرحلے پر جنین میں مُخلّقہ (Formed) یعنی بعض اعضاء کی بنیاد پڑ چکی ہوتی ہے اور اِن کی شکل واضح ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ غیر مخلقہ (Unformed) یعنی کچھ خلیات (Cells) ابھی تک غیر متعین (Undifferentiated) ہوتے ہیں اور وہ ابھی مکمل عضو کی شکل اختیار نہیں کر چکے ہوتے۔

پس یہ آیت نہ صرف انسان کے حیاتیاتی مراحل کو بیان کرتی ہے بلکہ "لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ" (تاکہ ہم تمہارے لئے حقیقت ظاہر کر دیں) کے الفاظ یہ اِشارہ دیتے ہیں کہ اب یہ مشاہدات انسانی عقل کیلئے خالق کی قدرت کو سمجھنے کا ایک ذریعہ بن چکے ہیں۔ یقین کریں کہ قرآن نے جو انسان کے حیاتیاتی مراحل کی تفصیل دی ہے اِسے صرف

آج کا انسان ہی صحیح معنوں میں واضح کر سکتا تھا اور تب تک قرآن انسانی شعور کے اِس مقام کا انتظار کرتا رہا۔ قرآن کی مذکورہ کا تعلّق براہِ راست ہدایت سے نہیں بنتا یعنی اگر آج سے ایک ہزار سال پہلے کا انسان کا اگر قرآنی کے اِن حیاتیاتی مراحل کو نہیں بھی سمجھتا تھا تو بھی قرآن اُس کیلئے ہدایت تھا لیکن چونکہ قرآن کا یہ اپنا دعویٰ ہے کہ وہ اِس کائنات کے خالق کا کلام ہے اِس لئے ضروری تھا کہ پھر یہ کلام انسان کو اپنی تخلیق کے معاملے میں ایسی مستقل معلومات دے کہ جسے انسانی شعور کسی بھی زمانے میں مشاہدات و تجربات کی چھلنی سے گزار سکے۔

یہاں پر ایک نکتہ واضح کرتا چلوں کہ قرآن طبیعیات و حیاتیات کی معلوماتی کتاب نہیں ہے لیکن جہاں پر یہ معلومات دینا ضروری سمجھتی ہے وہاں ضمناً یہ معلومات دے دیتی ہے۔ اِس لئے یہ عقیدہ رکھنا کہ قرآن سائنسی حقائق بیان کرنے کیلئے نازل ہوا ہے، درست نہیں۔ قرآن انسان کی کردار سازی کیلئے نازل ہوا ہے۔

پس انسان کی یہ خلقتِ عام یعنی حیات مذکورہ آیات کے علاوہ بھی متعدد آیات میں بیان کی گئی ہے لیکن غیر ضروری طوالت کے سبب مَیں باقی کی آیات ذکر نہیں کر رہا تاکہ موضوعات سلاست کے ساتھ آگے بڑھ سکیں۔ یہاں تک ہم اب انسان کے مادی اور حیاتیاتی وجود کی قرآنی وضاحت جان چکے ہیں۔

☆☆☆☆☆

شعورِ عام (عقل)

انسان کی خلقتِ اوّل اور خلقتِ عام یعنی مادہ و حیات کے مراحل ہم تفصیل سے جان چکے۔ اب تیسرے مرحلے میں انسان کی شعوری ملکیت ہے جس کا ذکر قرآن کرتا ہے۔ شعوری ملکیت سے مراد دراصل انسان کا عقل یافتہ یا ارسطو کی تعبیر کے مطابق انسان کا حیوانِ ناطق ہونا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

وَاللَّهُ أَخْرَجَكُم مِّن بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُونَ شَيْئًا وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ ۙ

اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا اِس حالت میں کہ تم کچھ نہ جانتے تھے، اور اُس نے تمھیں کان دیئے، آنکھیں دیں اور سوچنے والے دل دیئے۔

(سورہ النحل۔ آیت 78)

یعنی خدا نے انسان کو سماعت، بصارت اور فکری قوّت عطاء کی جس کی بنیاد پر وہ افلاطون اور ارسطو بن جاتا ہے۔ یہ ہے وہ عام شعور جو خدا نے ہر انسان کو خود عطاء کیا۔ پس جس طرح آج حیاتیات یہ ثابت نہیں کر سکتی کہ انسان کا مادہ کیسے پیدا ہوا اور پھر مادہ میں حیات کیسے پیدا ہوئی تو ٹھیک اِسی طرح یہ بھی ثابت نہیں کر پائی کہ حیات میں شعور کیسے پیدا ہوتا ہے۔

قرآن اعلان کر رہا ہے کہ حیات میں شعور خدائے قادر مطلق کی دَین ہے۔

وَهُوَ الَّذِي أَنشَأَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ ۚ -

وہی تو ہے جس نے تمہیں سماعت اور بصارت کی قوّتیں عطاء کی ہیں اور غور و فکر کیلئے دل دیئے۔(سورہ المؤمنون۔ آیت 78)

یہاں پر ایک نکتہ واضح کرنا ضروری ہے کہ قرآن غور و فکر کی صلاحیت کا مآخذ دل بتا رہا ہے جبکہ جدید اعصابی سائنس (Neuroscience) کے مطابق تو سوچنے سمجھنے کا کام دماغ (Brain) کا ہے حالانکہ یہ ایک قطعی حقیقت نہیں ہے۔

انسانی شعور آج بھی اعصابی سائنس میں ٹھوس مسئلہِ شعور (The Hard Problem of Consciousness) کہلاتا ہے اور اعصابی سائنس آج بھی حتمی طور پر نہیں جانتی کہ انسان کے سوچنے کا عمل انسانی وجود میں کس عضو سے طے پاتا ہے۔ اعصابی سائنس اب تک صرف باہمی تعلّق (Co-relation) ثابت کر پائی ہے کہ جب انسان گہری فکر میں ہوتا ہے تو پیشانی کے پیچھے والا حصّہ جسے طبی زبان میں Prefrontal Cortex کہا جاتا ہے متحرک ہو جاتا ہے۔ چنانچہ سائنسدان اب بھی یہ جاننے میں ناکام ہیں کہ انسانی شعور پیدا کیسے ہوتا ہے یعنی شعور کی تحریکِ اصلی (Original Movement) کہاں سے آتی ہے۔

پری فرنٹل کارٹیکس تو فکری تحریک کے وقت صرف متحرک ہو جاتا ہے نہ کہ دماغ کا یہ خاص حصّہ خود ہی تحریک پیدا کرتا ہے۔ دراصل یہی ماہرینِ اعصاب کا اصل امتحان ہے کہ اب وہ اِس حیران کُن اور دلچسپ تحریک کو خدا کی معرفت کا ایک ذریعہ بناتے ہیں یا صرف ایک مضحکہ خیز مسکراہٹ سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔

چلیں اگر ہم یہ بھی مان لیں کہ انسانی شعور کا کُلی طور پر ذمہ دار دماغ کا یہ پری فرنٹل کارٹیکس حصّہ ہے تو بھی اِس سے خدا کی ودیعت پر تو کوئی حرف نہیں آتا کہ دماغ کے اِس حصّے میں شعور ڈالنے والے یہ سائنسدان تو نہیں۔

علاوہ ازیں آج اعصابی سائنس کے ماہرین یہ بھی مان رہے ہیں کہ دل کا اپنا ایک چھوٹا سا اعصابی نظام ہوتا ہے جسے "The Little Brain in the Heart" کہا جاتا ہے۔ دل میں تقریباً چالیس ہزار نیورونز (اعصابی خلیے) ہوتے ہیں جو دماغ سے آزادانہ طور پر کام کر سکتے ہیں، یادداشت محفوظ کر سکتے ہیں اور احساسات کو محسوس کر سکتے ہیں۔

اِس کے علاوہ دل انسانی جسم میں برقی مقناطیسی توانائی (Electromagnetic field) کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اِس کی لہریں دماغ کی لہروں سے کئی گنا زیادہ طاقتور ہوتی ہیں اور یہ دماغ کے کام کرنے کے طریقے پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

اعصابی سائنس کے ماہرین اب یہ تسلیم کرتے ہیں کہ انسان دو طرح سے معلومات پروسیس کرتا ہے۔

دماغ(Intellect): یہ منطقی تجزیہ، حساب کتاب اور زبان کیلئے استعمال ہوتا ہے۔

دل(Intuition/Emotions): یہ اقدار(Values)، رحم، ہمدردی، محبت، وجدان اور گہرے فیصلوں کا مرکز ہے۔

جب قرآن کہتا ہے کہ "اُن کے دل ہیں مگر وہ اُن سے سمجھتے نہیں" (الأعراف۔ آیت 179) تو یہاں مراد وہ بصیرت ہے جو حق اور باطل کے درمیان فرق کرتی ہے۔ دماغ معلومات (Data) جمع کرتا ہے لیکن اِس معلومات کو 'معنی' (Meaning) دینا اور اِن سے 'ہدایت' لینا وہ عمل ہے جسے قرآن "قلب اور فؤاد" سے منسوب کرتا ہے۔

پرانے وقتوں سے لسانیات کا یہ عام محاورہ چلا آرہا ہے کہ "مَیں نے دل میں سوچا"، "میرے دل نے مجھ سے یہ کہا"، "میرا دل کررہا ہے"، "میرا دل اُداس ہے" جبکہ ایک موقع پر بھی آج انسان یہ نہیں کہتا کہ "میرا دماغ اُداس ہے" یا میرے دماغ نے سوچا چنانچہ زبان کا یہ اسلوب بہر حال مستند ہے اور قرآن نے بھی ٹھیک یہی اسلوب اختیار کیا۔

قرآن کہتا ہے کہ یہ خدا ہی ہے جس نے انسان کو غور و فکر کی قوّت یعنی شعور عطاء کیا۔ یہ وہی شعور ہے جس کے وسیلے سے آج ہم ہبل اور جیمز ویب ٹیلی سکوپ بنا کر خلاء نوردی کی نئی تاریخ رقم کر رہے ہیں۔ یہی وہ شعور ہے جسے استعمال کر کے ہم آج چاند پر رہائشی کالونی بنانے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ اب چاہے یہ شعور انسانی عضو دماغ میں نیورونز کی فائرنگ سے پیدا ہو یا پھر دل کے دھڑکنے سے، پس اِس کا اصلی مآخذ (Source) خدا تعالیٰ کی ذات ہے اور اگر خدا نہ چاہتا تو انسان حیوان سے آگے نہ بڑھ پاتا۔ چلیں حیاتیاتی اصطلاح میں اِسے "قدرتی انتخاب" بھی کہہ دیں تو بھی "قدرت" جسے قرآن حیّ و قیّوم ذات کہہ رہا ہے کا کردار آ تو گیا نا، گویا قدرت کے بغیر کوئی وضاحت ممکن ہی نہیں۔ شعورِ عام کے بعد بات یہاں ختم نہیں ہوتی۔ قرآن اب انسان کے اندر خدا کی خاص عطاء کردہ صفات داخل کر رہا ہے اور یہ چوتھا مرحلہ ہے۔ ایک بار پھر یاد کر لیں۔

پہلا مرحلہ انسان کا مادی وجود۔ دوسرا مرحلہ انسان کا حیوانی وجود۔ تیسرا مرحلہ انسان کا شعوری وجود اور اب چوتھے مرحلے یعنی انسان کے اخلاقی وجود کی وضاحت اگلے باب میں ملاحظہ کریں۔

☆☆☆☆☆

شعورِ خاص (اخلاقی حِس)

شعورِ خاص سے مراد دراصل انسان کا اخلاقی وجود (Moral Being) ہے۔ قرآن کا خدا انسان کو نہ صرف عام شعور سے بہرہ مند کرتا ہے بلکہ اُسے ایک ایسا شعور بھی دیتا ہے کہ جس کی بنیاد پر انسان حیوان سے ایک دم اُوپر اُٹھ جاتا ہے۔ اگر تو بات صرف ماہ، حیات یعنی زندگی اور شعورِ عام تک ہوتی تو انسان اور ایک بندر میں کوئی خاص فرق نہ ہوتا لیکن حاسہِ اخلاقی کے سبب اب انسان اِس پوری کائنات میں واحد حیوان ہے کہ جو نہ صرف اپنا اور دوسرے انسان کا بلکہ اِس کائنات کا اچھا بُرا بھی جانتا ہے۔ چنانچہ آج ہم کس بنیاد پر ماحولیاتی تبدیلی (Climate Change) کی بات کرتے ہیں اگر تو نہیں سمجھتے کہ یہ انسانیت کیلئے تباہ کُن ہے؟، یقیناً یہ ہمارے اخلاقی وجود ہی کا کرشمہ ہے کہ ہم نہ صرف اپنے معاشرے بلکہ پوری کائنات میں ہر طرح کی آلودگی کا احساس رکھتے ہیں۔

اخلاقی وجود کے متعلق فی الحال طبیعیات و حیاتیات کے پاس کچھ بھی نہیں ہے اور یہ معاملہ سماجیات (Social Sciences) کی طرف نکل آتا ہے اور سماجیات کے مطابق انسان کا اخلاقی وجود دراصل ذاتی مفاد (Vested Interest) کی بنیاد پر انسان کے اندر نمو پذیر ہوا یعنی چوری، دھوکہ دہی اور قتل و غارت ایک انسان اپنی

ذات کیلئے پسند نہیں کرتا اِس لئے انسان اِسے بُرے افعال سمجھنے لگا۔ انسان کے اخلاقی وجود کا مسئلہ اِس قدر پیچیدہ ہے کہ آج اِسی ایک مسئلے نے ملحدانہ تصوّرِ اخلاق اور سماجیات کے سارے افسانے طشت از بام کر دیئے ہیں۔ مادہ پرست ملحدین کا خیال ہے کہ اخلاقیات کا مآخذ اجتماعی شعور ہے حالانکہ تاریخ میں کئی ایسے انسانی اجتماع مل جاتے ہیں جو صرف اخلاقی بنیاد پر ایثار کا مظاہرہ کرکے اپنا آپ قربان کر دیتے ہیں۔ چنانچہ اِس معاملے میں فی الحال سماجیات اور ملحدانہ تصوّرِ اخلاق کوئی ایسی منظم فکر نہیں رکھتے کہ جو اِس وقت قابلِ اعتناء ہو۔ فلہٰذا رہاسہا واحد سہارا قرآن کا ہی رہ جاتا ہے اور آیئے اب قرآن کے اعلان پر غور کریں۔

وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا- فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا-

اور قسم ہے نفسِ انسانی اور اِس کے توازن کی، پس ہم نے ہی الہام کی انسانی نفس کو اُس کی بدی اور نیکی۔(سورہ الشمس۔ آیات 7-8)

یعنی انسان کے اندر خیر کا احساس اِس لئے واقع نہیں ہوا کہ یہ کوئی بظاہر مفاد کا مسئلہ ہے بلکہ خیر کی طلب انسانی نفس کا اصلی جوہر ہے، بالکل اِسی طرح شر کا احساس بھی انسانی مفادات کا تصادم نہیں بلکہ یہ وہ فطری رغبت ہے جو ایک انسان کے نفس میں موجود ہے۔ اب معاملہ کچھ اِس طرح صاف ہوتا ہے کہ انسان صرف مادہ کا ڈھیر یا

حیوانِ محض یعنی بیل، بکری یا اُونٹ نہیں بلکہ خیر و شر کا احساس رکھنے والا ایک اخلاقی وجود بھی ہے اور یہی اخلاقی وجود ایک باشعور حیوان کو صحیح معنوں میں انسان بناتا ہے اور یہی شعور انسان کو حیوانِ محض سے بھی بدتر بنا دیتا ہے۔ قرآن کی خبر ملاحظہ کریں۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ- ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ-

بات یہ ہے کہ ہم نے انسان کو حُسنِ تقویم میں خلق کیا، پھر یہ گرتا پڑتا بدترین اخلاقی مقام پر پہنچ جاتا ہے۔(سورہ التّین۔ آیات 3-4)

قرآنی اصطلاح حُسنِ تقویم کا عموماً یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ خدا نے انسان کو ایک خوبصورت جسمانی ساخت میں بنایا لیکن اگلی آیت پر غور کریں تو یہ مفہوم غیر متعلق ہو جاتا ہے اِس لئے یہاں اَحسنِ تقویم سے مراد دراصل حُسنِ خُلق ہے اور اَسفَلَ سافلین سے مراد دراصل انسان کا اخلاقیات سے کُلّی انحراف ہے۔یہی آیت دراصل انسان کے اندر موجود جمالیاتی احساس(Aesthetic Sense) کی بھی وضاحت کر دیتی ہے کہ انسان کے اندر حُسن کی طرف فطری کشش کیوں موجود ہے۔ حُسن(Beauty) کی طلب دراصل انسان کو اپنے ذاتی مفاد اور اجتماعی شعور سے بھی بالاتر کر دیتی ہے اور ایسا اِس لئے ہوتا ہے کہ خدا نے انسان کے باطن میں

حُسن کا احساس رکھ دیا ہے اور تمام فنونِ لطیفہ (Fine Arts) دراصل مظاہرِ اخلاق ہیں۔ پس آج طبیعیات، حیاتیات، اعصابیات اور نفسیات کے پاس انسان کے اِس حاسہ کے مآخذ بارے کوئی علم نہیں ہے۔

درج بالا آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے اندر خیر و شر اور حُسن کا احساس دراصل خدا تعالیٰ ہی کی دَین ہے اور یہ کسی ذاتی یا اجتماعی مفاد کی بنیاد پر پیدا ہونے والا احساس نہیں۔ اب اگر سماجیات یا مادیت کی بنیاد پر کوئی دانشور یہ دعویٰ کرنے پر بضد ہو کہ نہیں اخلاقیات کا مآخذ کا تو اجتماعی شعور ہے تو اُسے یہ اُلجھن حل کرنا ہو گی کہ اگر کسی زمانے میں اجتماعی شعور جھوٹ یا دھوکہ دہی کو سماجی ضرورت کے تحت جائز قرار دیدے تو کیا ایسی صورت میں جھوٹ یا دھوکہ دہی جائز ہو جائے گی؟، یقیناً نہیں کیونکہ یہ بات تو خدا کے منکر بھی مانتے ہیں کہ دھوکہ دہی بہر حال ایک اخلاقی جرم ہے اور کسی بھی صورت اِسے جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ پس یہ افسانہ کہ اخلاقیات کا مآخذ اجتماعی شعور ہے اِسی ایک اعتراض سے اپنی موت آپ مر جاتا ہے۔ خیر کا احساس انسانی مفاد یا اجتماعی شعور پر مبنی نہیں ہوتا چنانچہ دنیا میں کئی ایسے نفوس مل جاتے ہیں جنھوں نے اپنے ذاتی مفاد اور اجتماعی شعور سے بالاتر ہو کر وہ کارنامے سر انجام دیئے کہ دنیا آج بھی حیران ہے کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ چنانچہ انسان خود بھوکا رہ کر بھی دوسرے کو کھانا کِھلا دیتا ہے اور پورے اجتماعی شعور

کو چیلنج کرکے موت کو گلے لگا لیتا ہے، پس ایسا کیوں ہوتا ہے، اِس کا جواب صرف قرآن دیتا ہے اور قرآن کے علاوہ انسان کے اِس عمل کی توجیہ کوئی علم النفس، فلسفہ اور قانون نہیں دے سکتے۔ انسان کے اندر خیر کا حاسہ کیوں موجود ہے؟، اِس کا جواب مَیں نے علم النفس، فلسفہ اور سائنس میں بار بار کھوجنے کی کوشش کی لیکن کوئی ایک بھی تسلی بخش جواب نہیں پایا جبکہ قرآن واحد ذریعۂ علم ہے جو اِس سوال کا جواب بہت تسلی بخش انداز سے دے دیتا ہے، جس کا تذکرہ اب آئندہ کے ابواب میں آجائے گا۔

قرآن کے تصوّرِ انسان کا یہ چوتھا مرحلہ تھا اور اب اِس کی وضاحت کے بعد مَیں پانچویں اور آخری مرحلے کی طرف جارہا ہوں جس کے بعد انسان ایک باشعور، اخلاق یافتہ اور پوری طرح ذمہ دار وجود کے طور پر سامنے آجاتا ہے۔

☆☆☆☆☆

اِرادہ و اختیار (قوّتِ عمل)

اب ہم تصوّرِ انسان کے ایک ایسے مرحلے میں داخل ہو گئے ہیں کہ جس کی بنیاد پر انسان چاہے تو خدا کی برگزیدہ مخلوق فرشتوں سے بھی افضل بن جائے، چاہے تو خدا کی رذیل مخلوق ابلیس سے بھی دو قدم آگے نکل جائے اور یہ بنیاد ہے دراصل انسان کے پاس خدا کا اَمر یعنی روح یعنی اِرادہ و اختیار۔

اِرادہ و اختیار کو انگریزی میں Free Will کہا جاتا ہے اور یہ دراصل ٹھیک اُسی طرح خدا تعالیٰ کی دَین ہے جیسے مادہ، حیات، شعور، اخلاقی و جمالیاتی احساس ہے۔ اِرادہ و اختیار کو قرآن "روح" کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ۔

پھر جب مَیں انسان کو متوازن کر لوں اور اِس میں اپنی روح میں سے کچھ روح پھونک دوں تو تم اِس کے آگے سجدہ ریز ہو جانا۔ (سورہ الحجر۔ آیت 29)

اِرادہ و اختیار کا کمال دیکھیں کہ خدا تعالیٰ اپنی سب سے برتر مخلوق یعنی فرشتوں کو یہ حکم دے رہا تھا کہ جب مَیں انسان کو اِرادہ و اختیار سپرد کر دوں تو تم اِس خاص اعزاز کے بعد سجدہ ریز ہو جانا۔ ایک دوسرے مقام پر بھی یہی خبر دی گئی ہے۔

ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِن رُّوحِهِ

پھر انسان کو متوازن کیا اور اِس میں روح میں کچھ روح پھونک دی۔

(سورہ السجدہ۔ آیت 9)

واضح رہے کہ قرآن کی روح سے مراد یونانی فلاسفہ والی روح (Soul) نہیں اور نہ ہی یہ صوفیوں والی قُدسی روح ہے بلکہ قرآن کے مطابق روح سے مراد اِرادہ و اختیار ہے۔ اِرادہ و اختیار مطلقاً خدا تعالیٰ کی ملکیتِ اصلی ہے اور وہی ہے جس نے اپنی اِس لامحدود ملکیت میں سے کچھ محدود ملکیت انسان کو عطاء کر دی ہے۔

اب اِس نکتے پر غور کریں کہ اِرادہ و اختیار اپنی اصل میں کیا ہے۔ دیکھیں حیات یعنی زندگی اور شعورِ عام اور خاص سے تحریکِ عمل پیدا نہیں ہو سکتی جب تک کہ انسان کے پاس عمل کرنے کا آزاد اختیار موجود نہ ہو۔ پس یہ ضروری تھا کہ شعورِ عام اور شعورِ خاص دینے کے بعد انسان کو عمل کا انتخاب بھی دے دیا جاتا تا کہ انسان کا مقصدِ حیات پورا ہو جائے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ہماری اِس پوری کائنات میں اِس وقت کوئی بھی ایسی مخلوق موجود نہیں کہ جس کے پاس خدا کی یہ روح یعنی اِرادہ و اختیار موجود ہو، یہ تو صرف ایک انسان ہی ہے جس کے پاس بیک وقت زندگی، شعورِ عام و شعورِ خاص اور اِرادہ و

اختیار موجود ہے اور اِسی اِرادہ و اختیار کی بنیاد پر انسان آج خدا تک کو چیلنج کر کے ظلم کا بازار گرم کئے ہوئے ہے۔

بالفرض انسان کے پاس شعورِ عام و خاص تو ہوتا مگر عمل کی صلاحیت نہ ہوتی تو انسان خدا کی اسکیم کا حصّہ ہی نہ ہوتا کیونکہ اخلاقی احساس کے بعد اگر عمل کی مکمل آزادی نہ ہو تو وہ احساس اپنی ذات میں بیکار ہو جاتا ہے۔

یہ اِرادہ ہی ہے جس سے ہر جذبہ (Emotion) پھوٹتا ہے چنانچہ رحم، ہمدردی، محبت، عشق، وفاداری اور ایثار اِرادے ہی کی مختلف اقسام ہیں جسے انسانی اختیار عملی شکل دیتا ہے۔ یعنی انسانی جذبات کا تخمِ اصلی اِرادہ ہے اور اِن جذبات کی عملی صورت اختیار سے رونما ہوتی ہے۔

پس قرآن کے تصوّرِ انسان کا یہ آخری پانچواں مرحلہ ہی انسان کی اصل قدر و قیمت متعین کرتا ہے اور یہی وہ مرحلہ ہے جس کی بنیاد پر انسان یا تو مستقل خسارے کا حامل ہو جاتا ہے یا پھر مستقل کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔ اب ہم دیکھیں گے کہ خدا نے انسان کو شعورِ عام و خاص اور اِرادہ و اختیار کیوں دیا اور اِس کے پیچھے خدائی استدلال کیا ہے۔

☆☆☆☆☆

مقصدِ حیات

آج کے شعور کا عمومی تاثر یہ ہے کہ ہماری یہ زندگی محض ایک المناک حادثہ ہے اور اِس کا کوئی متعین مقصد نہیں ہے۔ پس جس قدر ممکن ہو سکے جہد للبقاء (Survival) جاری رکھو اور جتنی مسّرت (Pleasure) حاصل کر سکتے ہو کرتے جاؤ۔ لیکن قرآن کے نزدیک انسانی زندگی ایسی بے مصرف اور مضحکہ خیز نہیں ہے بلکہ قرآن انسان کو زندگی، شعورِ عام و خاص اور اِرادہ و اختیار اِس لئے نہیں دے چکا کہ انسان یہاں جانوروں سے بھی بدتر زندگی گزار کر مر کھپ جائے۔

قرآن یہ اعلان کرتا ہے کہ انسان بھلے شعورِ عام و خاص اور اِرادہ و اختیار رکھتا ہو لیکن پھر بھی خسارے (Deficit) میں جا رہا ہے جب تک ایمان اور عملِ صالح نہ حاصل کر لے۔ یہاں پر مَیں نے جان بُوجھ کر قرآنی اصطلاح خسارہ کا انگریزی ترجمہ Deficit کیا ہے کیونکہ معاشیات میں یہ خاص اصطلاح اُس وقت استعمال ہوتی ہے جب آپ کے اخراجات آمدنی سے بڑھ جاتے ہیں۔ پس ایمان ایک انسان کا اصل سرمایہ (Capital) ہے اور اگر یہ کم ہو جائے تو اعمال چاہے بظاہر بہت اچھے کیوں نہ ہوں فائدہ مند نہیں رہتے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

وَالْعَصْرِ ﴿١﴾ إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِي خُسْرٍ ﴿٢﴾ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ﴿٣﴾-

قسم ہے چلتے زمانے کی، بلاشبہ انسان خسارے میں ہے، مگر وہ لوگ جو ایمان لا کر حُسنِ عمل پر کاربند ہو گئے، اور ایمان کے راستے میں صبر کا دامن تھام لیا اور (یہ ایمان اپنی ذات تک محدود نہ رکھا) بلکہ دوسروں کو اِس کی تلقین بھی کرتے رہے۔ (پس یہی لوگ ہیں جو خسارے سے بچ گئے)۔ (سورہ العصر)

آجکل عموماً یہ جملہ کہا جاتا ہے کہ مَیں ایک اچھا انسان ہوں۔ جھوٹ نہیں بولتا۔ کسی کو دھوکہ نہیں دیتا۔ ضرورت مندوں کی مدد کرتا ہوں تو پھر مجھے کیوں کسی خدا رسول یا آخرت پر ایمان لانا چاہئے جبکہ اِس ایمان کے بغیر مَیں ایک عمدہ اخلاقی زندگی گزار رہا ہوں؟۔

اِس سوال کا نہایت سادہ جواب یہ ہے کہ خدا پر ایمان کے بغیر دو مسائل کا کوئی حل ممکن نہیں، الفاظ پر پھر غور کریں کہ حل "ممکن ہی نہیں"، جی ہاں قطعی طور ممکن نہیں۔ پہلا مسئلہ عدل ہے اور دوسرا جہالت۔ عدل یہ کہ چلو آپ تو بغیر ایمان کے بھی ایک عمدہ اخلاقی زندگی گزار رہے ہیں لیکن جس کے ساتھ آپ نیکی کر رہے ہیں اُس بیچارے کے ساتھ آپ جیسا ایک انسان زیادتی بھی کر رہا ہے اور وہ اِس

زیادتی کے آگے کوئی بندھ نہیں باندھ سکتا کیونکہ وہ کمزور ہے اور زیادتی کرنے والا طاقتور۔ بتائیے اب اِس بیچارے کو کیا تسلی دیں گے؟، یہی کہ ظلم سہتے رہو حتیٰ کہ مر جاؤ یا یہ کہ مزاحمت کر کے مر جاؤ اور خدا کے ہاں ماجور (اَجر یافتہ) ہو جاؤ یا پھر لڑتے لڑتے ظالم کا قلع قمع کر دو؟۔ پس ایمان ایک مؤمن کو ظلم کے خلاف نہ صرف اُبھارتا ہے بلکہ ظلم کا خاتمہ کرنے کی ہمت بھی عطاء کرتا ہے کیونکہ ظلم کے خلاف لڑائی اسلامی اصطلاح میں " جہاد" کہلاتی ہے اور اِس لڑائی میں موت بھی اصل کامیابی ہے اور ظلم کا خاتمہ بھی۔

دوسرا مسئلہ جہالت ہے کہ انسان دراصل ہے کیا شے؟، کیا یہ ایک المناک حادثہ ہے یا اِس کائنات کے خالق قادر مطلق خدا کی سوچی سمجھی اسکیم؟، اگر تو انسان ایک المناک حادثہ ہے پھر تو فرانسیسی فلسفی البر اکامیو کی طرح بہترین عمل "خود کشی" ہے اور اگر انسان خدا کی ایک سوچی سمجھی اسکیم ہے تو پھر ایمان اور حُسنِ عمل کے علاوہ کونسی صورت باقی بچتی ہے؟۔ پس ایمان کے بغیر ایک انسان کی نہ تو زندگی کا کوئی مطلب نکلتا ہے اور نہ ہی موت کا۔ قرآن ایمان کو ایک "امانت" کی حیثیت سے پیش کرتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ ایمان کے بغیر انسان صرف شعور کی بنیاد پر جہالت اور ظلم سے جان نہیں چھڑا سکتا۔ ملاحظہ فرمائیں۔

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَن يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنسَانُ ۖ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا۔

ہم نے آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے یہ امانت (ایمان) پیش کی پھر اُنہوں نے اِسے اُٹھانے سے انکار کر دیا اور اِس سے ڈر گئے اور انسان نے اِسے اُٹھا لیا۔ بے شک انسان بڑا ظالم اور جاہل تھا۔ (سورہ الاٗحزاب۔ آیت 72)

یعنی جب انسان کو خدا تعالیٰ نے شعورِ عام و خاص اور اِرادہ و اختیار عطاء کیا تو خدا نے اِس کے سامنے اپنی ذات، ہدایت، ہدایت لانے والوں اور یوم الحساب پر ایمان لانے کی پیشکش کی تو زمین، آسمان اور پہاڑ کی نسبت انسان شعوری اور اخلاقی طور پر اتنا مضبوط نکلا کہ اُس نے اِس پیشکش کو قبول کر لیا اور اِسی امانت کو اُٹھا لینے کے بعد اِرادہ و اختیار سے جنم لینے والا ظلم عدل میں بدل گیا اور شعورِ عام کی بنیاد پر پیش آنے والی جہالت اب علم میں بدل گئی، یعنی ایمان ہی علم و عدل کا ضامن بن گیا۔

یہاں پر اِس نکتے کی وضاحت ضروری ہے کہ جس کی بنیاد پر عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ اِس آیت میں امانت سے مراد ایمان نہیں بلکہ اِرادہ و اختیار ہے حالانکہ یہ اَمر بدیہی ہے کہ محض اِرادہ و اختیار کا حامل ہونے سے انسان ظلم اور جہالت سے نجات حاصل نہیں کر سکتا اور یہ تو ہمارا روز کا مشاہدہ ہے کہ اِرادہ و اختیار ہی عموماً ظلم کا

سبب بن جاتا ہے جبکہ خدا تعالیٰ فرما رہا ہے کہ انسان اِس امانت کو اُٹھانے سے قبل ظالم اور جاہل تھا تو اب محض اِرادہ و اختیار انسان سے ظلم اور جہالت کو دُور نہیں کر سکتا اِس لئے یہ ضروری ہے کہ یہاں امانت سے مراد ایمان لیا جائے جس کو حاصل کر لینے کے بعد وقت کے ظالم عادل بن جاتے ہیں اور پرلے درجے کے جاہل اصحابِ علم بن جاتے ہیں۔

قرآن کے نزدیک کوئی بھی اچھا عمل ایمان کے بغیر مردود ہے اور ایمان کا اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ حُسنِ عمل کے بغیر کسی کام کا نہیں ہے۔ پس قرآن کو ایسا انسانی عمل مطلوب ہے جس کی بنیاد ایمان پر قائم ہو ورنہ کوئی بے ایمان زیادہ سے زیادہ ایک ہمدرد حیوان (Sympathetic Animal) کے علاوہ کیا پہچان رکھتا ہے؟، اور یہ ہمدردی بھی تبھی واقع ہوتی ہے جب یہ حیوان ہر طرح کی عیاشیاں کر کر کے تھک جاتا ہے۔ قرآن کے نزدیک بے ایمانی بدترین اخلاقی جرم ہے جس کی سزا ابدی جہنم ہے اور ایسا کیوں نہ ہو کہ ایک انسان یہ جان کر بھی خدا کے مقابلے میں کھڑا ہو جائے کہ وہ مختارِ کُل نہیں بلکہ عبدِ مختار ہے۔ بات یہ ہے کہ خدا نے بلا رنگ و نسل و ملک وملت ہر انسان کو شعورِ عام و خاص اور اِرادہ و اختیار دے دیا ہے لیکن ایمان خدا نے کسی کو نہیں دیا بلکہ اپنے انبیاء و رُسل کے ذریعے پیش کر دیا۔ سو اب کوئی چاہے تو خدا تعالیٰ کی یہ پیشکش قبول کر لے، چاہے تو مسترد کر دے، پس زور

زبردستی والا معاملہ نہیں۔ لیکن اب یہی پیشکش انسان کا اصل امتحان بھی بن گئی۔ قرآن کا اعلان ملاحظہ فرمائیں۔

إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا- إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا-

ہم نے انسان کو ایک مخلوط قطرے سے پیدا کیا، اِس کی لیاقت ظاہر ہو جائے اِس لئے اِسے سماعت وبصارت عطاء کی، ہم نے اِسے اب راستہ دِکھا دیا چاہے تو شکر گزار بن جائے، چاہے تو ناشکرا۔ (سورہ الاِنسان۔ آیات 2-3)

یہ راستہ کیا ہے ؟، یہی ہدایت یعنی قرآن جس کی بنیاد پر مَیں اتنی لمبی چوڑی بحث کر رہا ہوں۔ شعورِ عام و خاص اور اِرادہ و اختیار کا مقصدِ اصلی ایمان اور حُسنِ عمل کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے ؟۔ دیکھیں ایمان ہے تو پھر عمل بھی کرنا ہو گا، جب عمل کر لیا تو اُس کا کوئی نتیجہ بھی نکلنا چاہیئے اور نتیجہ بر آمد کرنے سے قبل عمل کی مکمل آزادی اور مقررہ وقت بھی ملنا چاہیئے۔ پس اب مقررہ وقت یہ دنیا ہے اور نتیجے کا موقع آخرت اور ایمان کا بندوبست یہ ہدایت یعنی قرآن ہے۔ بتایئے اِس سے زیادہ بھی کوئی نظامِ فکر منطقی ہو سکتا ہے بھلا؟۔

ایمان اختیار کرنے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔ قرآن کا اعلان ملاحظہ فرمائیں۔

لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ ۖ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ

دین میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے پس ہدایت گمراہی سے الگ ہو چکی۔

(سورہ البقرہ۔ آیت 256)

یعنی ہدایت ایسی خفیہ یا گڈ مڈ نہیں کہ گمراہی اور ہدایت کا کوئی پتہ ہی نہ چل سکے بلکہ قرآن کے نزول کے بعد اب ہدایت ہر طرح کی گمراہی سے قطعی طور پر ممیز ہو چکی ہے۔ پس اب جو چاہے اِسے قبول کر لے اور جو چاہے اِس کو مسترد کر دے۔ یہی مضمون ایک اور مقام پر بھی آچکا ہے۔

وَقُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ ۖ فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ ۚ

اے نبی! صاف کہہ دیجئے کہ یہ (ہدایت) حق ہے تمہارے ربّ کی طرف سے، پس اب جس کا جی چاہے مان لے اور جس کا جی چاہے انکار کر دے۔

(سورہ الکہف۔ آیت 29)

یعنی ایمان اختیار کرنے میں کوئی زور زبردستی نہیں لیکن پھر انکار کرنے کے بعد انجام کے معاملے میں بھی کوئی فریاد نہیں سنی جائے گی کیونکہ حق کو ہر لحاظ سے سمجھ لینے کے بعد اگر کوئی اِسے مسترد کر لے گا تو وہ خدا کے ہاں بہرحال ماخوذ

(Accountable) ہو گا۔ قرآن کا پیشِ نظر انسان دیگر اشیاء کی طرح محض ایک شے نہیں بلکہ شعورِ عام و خاص اور اِرادہ و اختیار دیئے جانے والی ایک ذمہ داری ہستی ہے جس کی زندگی کا اصلی مقصد عبودیتِ خداوندی ہے تاکہ یہی ہستی ایمان اور حُسنِ عمل کے ذریعے سے خدا کے ہاں اَبدی تسکین کا مقام (جنت) حاصل کر لے۔ قرآن کا اعلان ملاحظہ فرمائیں۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ۔

اور ہم نے جِن واِنس کو اپنی عبادت کیلئے پیدا کیا۔ (سورہ الذّاریات۔ آیت 56)

یعنی انسان کی زندگی کا مقصد عبودیتِ خداوندی ہے جس کا لازمی نتیجہ ایمان اور حُسنِ عمل کی صورت میں نکلتا ہے اور پھر ایمان اور حُسنِ عمل کا انجام خدا کے ہاں اَبدی تسکین یعنی جنت کی صورت میں نکلتا ہے جہاں انسان موت سے بھی آزاد ہو جائے گا۔ پس قرآن کا پیشِ نظر انسان ایک ایسی ہستی ہے جس کی زندگی اور موت دونوں بامعنٰی اور ایک خاص مقصد کے تحت واقع ہوتے ہیں تاکہ انسان مستقل طور پر خدا کی ابدیت میں شامل ہو جائے۔ بتایئے اِس سے بھی بہتر اور معقول کوئی وضاحت بھلا ہو سکتی ہے جو ایک حیوان کو اُس اعلیٰ ترین درجے تک پہنچا دے کہ جہاں انسان خود خدا کی جنت میں ایک اَبدی حیات سے ہمکنار ہو جائے؟، یقیناً نہیں

ہو سکتی۔ پس یہ ہے انجامِ خیر اُس حیوان کا جسے آج ہم ایک المناک حادثہ ٹھہرا کر ایک کتے اور بھیڑیے سے بھی بدتر درجے میں گھسیٹ لاتے ہیں۔

دعا ہے کہ خدا تعالیٰ ہمارا انجام بخیر کرے۔ آمین

وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلٰكِن كَانُوا هُمُ الظَّالِمِينَ۔

اور ہم نے اُن پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنے اُوپر ستم ڈھاتے رہے۔

(سورہ الزّخرف۔ آیت 76)

☆☆☆☆☆

قرآن کا انسانی ماڈل

قرآن کا انسانی ماڈل دراصل واحد ماڈل ہے جو انسانی عقل اور نفسیات کی تمام ضرورتیں بدرجہِ اَحسن پوری کردیتاہے۔ آیئے غور کریں۔

قرآنی ماڈل

موت	زندگی
دنیا	آخرت
جنت	جہنم

موت

اپنے وجود پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم کبھی نہیں تھے اور اب ہیں، آخر کیوں ہیں؟،اِس لئے کہ دوانسانوں یعنی ایک مرد اور ایک عورت نے اپنے اِرادے سے جنسی تعلق قائم کرنے کی کوشش کی جس کے بعد ایک معلوم حیاتیاتی عمل شروع ہوااور پھر ہم ایک عورت کے پیٹ سے باہر نکل آئے۔ سوال یہ ہے کہ جن دوانسانوں نے ایک مشترکہ ٹُول یعنی اِرادہ استعمال کیا، یہ ٹُول اِن دونوں کا ذاتی تھایا

کہیں سے لیا تھا؟۔ ظاہری بات ہے کہ یہ اِن کا ذاتی نہیں تھا اور نہ اِن کے پاس ہمیشہ رہتا، اِس لئے یہ عطائی تھا اور یہ اِرادہ ایک کامل اِرادے (Perfect Will) نے اِنہیں عطاء کیا۔ قرآن کے مطابق یہ کامل اِرادہ خدا قادرِ مطلق ہے۔

زندگی

کہانی کچھ یوں ہے کہ ایک کامل اِرادے نے دو ناقص اِرادوں کو یہ قوت دی کہ وہ زندگی پیدا کرنے کی سعی کریں اور یوں کامل اِرادے نے ایک زندگی پیدا کر دی اور یوں انسان وجود میں آ چکا۔ اب پہلا سوال یہ ہے کہ انسان کیوں وجود میں آیا؟۔ اِس سوال کا جواب کامل اِرادے کی طرف سے نازل کردہ تعلیم کے مطابق یہ ہے کہ انسان یعنی ناقص اِرادہ اپنی مرضی سے کامل اِرادے کی قوت قبول کر کے ویسے زندگی گزارے جیسے کامل اِرادے نے نازل کی ہے اور پھر اِس کے عوض ناقص اِرادہ کامل اِرادے کے ہاں ایک ابدی زندگی حاصل کر لے۔

چنانچہ اب ضروری تھا کہ کامل اِرادہ یعنی خدا قادرِ مطلق انسان کو ایک ناقص عقل، ناقص اخلاقی و جمالیاتی شعور اور ناقص اِرادہ و اختیار دیدے تا کہ اِنہی ٹُولز کی بنیاد پر عمل کا میدان واقع ہو سکے۔ پس عمل کا میدان یہ دنیا ہے۔

دنیا

دنیا کچھ نہیں سوائے اِس کہ ایک ناقص عقل، ناقص اخلاقی و جمالیاتی شعور اور ناقص اِرادہ و اختیار کا حامل وجود یعنی انسان پوری آزادی کے ساتھ اپنے اِن ٹولز کو استعمال کرکے عمل پیدا کرتا چلا جائے۔ ایسا وجود جس کے پاس اِرادہ و اختیار کی قوت ہو بھلے وہ ناقص ہو لیکن پھر بھی وہ اِس ٹول کا آخری درجے میں غلط استعمال کر سکتا ہے، بالکل کرے گا اور پھر اِسی سے ظلم و زیادتی، قتل و غارت، دنگا فساد، ریپ اور دیگر جرائم پیدا ہوں گے۔ لیکن بات یہاں ختم نہیں ہوتی کیونکہ آگے کی ایک منزل ابھی باقی ہے اور وہ منزل ہے آخرت یعنی اپنے اعمال کا حساب دینا۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ظلم نقد ہے لیکن انصاف اُدھار، خیر نقد ہے لیکن اَجر اُدھار، آخر کیوں؟، اِس لئے کہ دنیا صرف اور صرف عمل کا میدان ہے، نتیجے کا نہیں، پس نتیجے کا میدان یوم الحساب یعنی آخرت ہے۔

آخرت

آخرت کیوں ضروری ہے؟، اِس لئے کہ وہ انسان جس کو اِرادہ و اختیار دیا گیا تھا اُس کی باز پُرس تو ضروری تھی نا کہ وہ کیا کچھ کر چکا۔ یہاں پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ظالم رہا نہ مظلوم تو ایسی صورت میں دونوں واپس ایسی حالت میں کیسے موجود

ہو سکتے ہیں کہ اُن دونوں کو اُن کے اعمال کا نتیجہ دیا جائے ؟، تو اِس سوال کا بالکل سادہ جواب یہ ہے کہ جس کامل اِرادے نے ایک پانی کی بوند سے چند ماہ میں ارسطو اور افلاطون پیدا کر لیا وہ کامل اِرادہ کیا اِس اَمر پر قدرت نہیں رکھتا کہ وہ ایک بار پھر سے ظالم اور مظلوم کو کھڑا کر کے اُن کا حساب برابر کر دے؟، عقل تو یہی کہتی ہے، ہاں بالکل، ایک کامل اِرادہ جب ایک بار زندگی دے سکتا ہے تو پھر دوسری بار کیوں نہیں، بلکہ دوسری بار تو پہلی بار سے زیادہ آسان ہے۔ یہی ہے دراصل یومِ آخرت کا وہ یقین جو دنیا کو ایک اندھے اور ظالم اِرادے سے محفوظ کر لیتا ہے۔

جنت

جنت یعنی حساب کتاب کے بعد کا مرحلہ۔ جب ایک مفلس اور لاچار نیک انسان کو اُس کے نیک اعمال کا دنیا میں کوئی صلہ نہیں ملا تو کیا یہ ضروری نہیں تھا کہ اُسے اب حساب کتاب کے بعد ماجور (Compensate) کیا جائے ؟، بالکل ضروری تھا تو بس پھر جنت دراصل اُس نیک انسان کے نیک اعمال کا بدلہ ہے۔

جہنم

جہنم یعنی حساب کتاب کے بعد کا مرحلہ۔ جب ایک ظالم کو اُس کے ظلم کی کامل سزا دنیا میں نہیں ملی اور وہ ظلم کر کے بھی ایک پُر آسائش زندگی گزار کر مر گیا تو کیا یہ

ضروری نہیں تھا کہ اُس ظالم کو ایک بار پھر سے اُٹھا کر اُس کے ظلم کا حساب کیا جاتا؟، بالکل ضروری تھا اور جب ظالم اپنے اعمال کے سبب سزا کا حقدار ٹھہرتا ہے تو وہ جہنم میں چلا جاتا ہے۔

بتایئے اب! کیا یہ پورا انسانی ماڈل نہایت معقول اور بہت تسلی بخش ہے یا نہیں؟، اور کیا ایک ناقص انسانی عقل اِس طرح کا کامل ماڈل خود سے گھڑ سکتی ہے؟۔ اِس کا فیصلہ آپ خود کریں۔ اب دیگر انسانی ماڈلز بھی دیکھ لیں تاکہ موازنہ کرکے آپ اپنے لئے کسی ایک ماڈل کا انتخاب کرلیں۔

☆☆☆☆☆

دیگر معروف انسانی ماڈل

دیگر انسانی ماڈلز میں سب سے قدیم سناتنی، صوفیانہ اور ملحدانہ ماڈل ہیں۔ سناتنی اور صوفیانہ ماڈل دراصل ایک ہی ماڈل کی دو مختلف صورتیں ہیں جبکہ ملحدانہ ماڈل اصل میں کوئی ماڈل ہی نہیں ہے۔ آیئے غور کریں۔

سناتنی ماڈل

سناتنی ماڈل یعنی قدیم ہندو ماڈل جسے قدیم اصطلاح میں سناتن دھرم بھی کہا جاتا ہے۔ سناتن دھرم میں کامل اِرادہ دراصل تِری گُنہ (Three Dimensional) ہے اور اِس کا پہلا ظہور (Emergence) برہم سے ہوتا ہے اور یہ کامل اِرادے کا تخلیقی عمل ہے۔ دوسرا ظہور یہ کامل اِرادہ وِشنو کی شکل میں کرتا ہے جو تخلیق کو جاری رکھنے کا عمل ہے۔ تیسرا ظہور کامل اِرادہ مہیش کی شکل میں کرتا ہے اور یہ تخلیق کو وِناش (Dissolve) کرنے کا عمل ہے۔ سناتن دھرم میں یہ انسانی ماڈل سب سے پہلے ہندوستان کے قدیم وِدوان (Philosopher) کپل مُنی نے سانکھ درشن کی صورت میں دیا تھا، جو آج بھی اُسی صورت میں موجود ہے۔

برہم

کامل اِرادہ جب تخلیقِ انسانی کے عمل سے گزرتا ہے تو وہ برہم کہلاتا ہے اور برہم کی کامل قوّت صرف تخلیقِ مادہ تک ہی محدود ہے۔

وِشنو

یہ کامل اِرادے کی دوسری صورت ہے جس میں وہ ایک پالنہار کی شکل میں پراگھٹ (Emerge) ہوتا ہے۔

مہیش

کامل اِرادہ جب وِناش کی شکتی (Will) میں پراگھٹ ہوتا ہے تو وہ مہیش یا شیو بن جاتا ہے۔ کپل مُنی کامل اِرادے کے اِنہی تین گُن کو رَجس، تَمس اور سَتو کی اصطلاحات سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ چنانچہ جب کامل اِرادہ انسانی شکل میں اَوترِت (Descend) ہوتا ہے تو وہ اَوتار (Avatar) بن جاتا ہے۔ یوں وِشنو کے اَوتاروں میں رام اور کرشن وغیرہم اور مہیش کے اَوتاروں میں گنیش اور بولے ناتھ وغیرہم کی شکل میں چلتا پھرتا انسان بن جاتا ہے۔ پھر یہی انسان اپنے سُکرم (نیک اعمال) کے سبب ناقص اِرادہ یعنی انسانی وجود سے مُکتی پا کر پھر سے برہم

میں لِین ہو جاتا ہے یا پھر اِس کے بر عکس کُکرم (بد اعمال) اختیار کر کے پُنر جنم (Reincarnation) کے چکر میں کُتے، بلی اور گدھے کی شکل میں بار بار ناقص اِرادے میں چکر لگا تا رہتا ہے۔ پس سناتن دھرم کا پورا فلسفہ اِسی "چکر" پر کھڑا ہے۔ سناتنی ماڈل میں ناقص اِرادے یعنی انسان کی زندگی کا اصل مقصد سُکرم اختیار کرے واپس برہم میں لِین ہونا ہے اور بس۔

صوفیانہ ماڈل

صوفیانہ ماڈل جسے باطنی ماڈل بھی کہا جا سکتا ہے دراصل ایک ایسا ماڈل ہے جو دنیا کے دو بڑے ماڈلز سے بالکل ایک مختلف ماڈل ہے یعنی پہلا قرآن کا انسانی ماڈل کہ جس میں انسان خدا قادر مطلق کا بندہ ہے اور اپنے ربّ کی عبادت کیلئے پیدا کیا گیا ہے۔ چنانچہ اِسی عبادت کو اختیار کرنے کیلئے خدا نے انسان کو خیر و شر کی صلاحیتیں دے کر امتحان کیلئے دنیا میں بھیج دیا تا کہ انسان اپنے اچھے اعمال کے سبب روزِ قیامت حساب دے کر جنت داخل ہو جائے۔

دوسرا سناتنی ماڈل جس میں انسان اصل میں اپنے کرم (عمل) کے سبب اپنے لئے شریر چُنتا ہے چنانچہ بُرے کرموں کے سبب وہ کبھی ہاتھی بندر اور کچھوے کی شکل میں دنیا میں آ جاتا ہے اور کبھی اچھے کرموں کے سبب انسان بن کر مکتی (نجات) پا

لیتا ہے۔ علاوہ ازیں سناتن دھرم میں قرآن کی طرح ایک قادر مطلق خدا کا کوئی تصوّر موجود نہیں ہے بلکہ خدا خود تری گُنہ (Three Dimensional) ہے جس کی تفصیل گزر چکی۔

اب ایک تیسرا ماڈل یعنی وجدانی یا صوفیانہ ماڈل ہے جو نہ تو خدا اور مخلوق میں دوئی پیدا کرکے خدا کو انسان سے مستقل الگ کرکے اُس پر حاکم بنا دیتا ہے اور نہ ہی انسان کو فی نفسہٖ خدا بنا کر علم و اخلاقیات کی بنیاد ہی تحلیل کر دیتا ہے بلکہ یہ ایک ایسا عجیب ماڈل ہے جس میں ظاہری طور پر قرآن کی طرح کا عبد و معبود کا تصوّر بھی موجود ہے اور باطنی طور پر وحدت الوجود کا تصوّر بھی موجود ہے یعنی خدا انسان سے بالکل جدا کوئی الگ مستقل وجود نہیں ہے۔ یہ ذرا پیچیدہ ماڈل ہے اِس لئے اکثر اِس کی تعبیرات میں انسان اُلجھ جاتا ہے۔

کچھ مسلم متکلمین کا خیال ہے کہ تصوّف کا انسانی ماڈل اور سناتنی ماڈل اپنی اصل میں ایک ہے جبکہ یہ ایک نہایت فضول دعویٰ ہے کیونکہ کہاں سناتن دھرم اور کہاں صوفیانہ منہج۔ سناتن کی بنیاد ہی پُنر جنم (Reincarnation) پر ہے جبکہ تصوّف میں کوئی بھی انسان محض اپنے اعمال کے سبب مظہرِ خدا نہیں بنتا بلکہ وہ مظہرِ خدا ہے بس اُسے پہچان یعنی عرفان حاصل کرنا ہے۔

صوفیاء کا معروف قول ہے کہ من عرف نفسه فقد عرف ربّه یعنی جس نے اپنی ذات کو پہچان لیا اُس نے اپنے خدا کو پہچان لیا یعنی صوفیانہ ماڈل کی جڑیں خود قرآن میں موجود ہیں۔ قرآن میں ہے

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۗ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ۔

ابھی ہم اُنہیں دِکھادیں گے اپنی نشانیاں کائنات اور خود اُن کے اپنے نفوس میں حتیٰ کہ اُن پر واضح ہو جائے گا کہ وہی حق ہے، تو کیا تیرے ربّ کا ہر شے پر گواہ ہونا کافی نہیں؟۔(سورہ فصّلت۔ آیت 53)

اپنے نفوس میں حق دِکھادینے کی سادہ تعبیر یہی ہے کہ انسان کی حقیقی عبادت اُس کے ربّ کی معرفت ہے۔یعنی یہی وہ سرِّ الاکبر ہے کہ ایک صوفی جب اپنے وجدانی تجربات سے خدا کی معرفت حاصل کرلیتا ہے تو وہ خدا نہیں بن جاتا بلکہ چلتی پھرتی خدا کی نشانی بن جاتا ہے جسے صوفیانہ اصطلاح میں مظہرِ خدا کہا جاتا ہے۔

تصوّف میں تزکیہِ نفس کے ذریعے سے انسان خدا نہیں بنتا اور نہ ہی نجات حاصل کرتا ہے بلکہ یہ قدرت تو اُسے پہلے ہی سے حاصل ہے یعنی محلِ وحدت سے وہ کبھی محروم ہی نہیں ہوا پس اصل ریاضت عرفان کی ہے۔ع

حلول و اِتّحاد ایں جا محال است
که در وحدت دوئی عین ضلال است

مزید تفصیل آپ میرے مقالہ "متصوّفانہ تصوّرِ انسان" میں دیکھ سکتے ہیں۔

ملحدانہ ماڈل

ملحدانہ ماڈل سے مراد دراصل مادہ پرستوں (Materialists) کا ماڈل ہے۔ ملحدانہ ماڈل کے حامل یہ سمجھتے ہیں کہ کامل اِرادہ تو ہے لیکن وہ خود اندھا (Blind) اور لاشعور (Unconscious) اور لاحِس (Apathetic) ہے فلہٰذا ناقص اِرادے میں بھی یہ صفات در آئی ہیں اور انسان بھی ایک المناک حادثہ ہے۔ اِس لحاظ سے ایک مادہ پرست سمجھتا ہے کہ زندگی میں کوئی مقصد نہیں ہے اور اگر کوئی واحد کام کرنے کا ہے تو وہ صرف نفس پرستی (Hedonism) ہے یعنی جس قدر اور جیسے بھی ممکن ہو لذت حاصل کرتے جاؤ یہاں تک یہ ناقص اِرادہ ایک دن اچانک خود ہی تحلیل ہو جائے۔ پس قرآنی ماڈل کے علاوہ مَیں نے یہ تین معروف انسانی ماڈل بھی بیان کر دیئے تاکہ یہ بحث مکمل ہو جائے اور سمجھنے والوں کے سامنے تمام انسانی ماڈل پوری طرح واضح ہو جائیں۔ پھر انتخاب ہر انسان کا اپنا اپنا۔

☆☆☆☆☆

قرآن کا تصوّرِ انسان

عقل

سوچنے، سمجھنے اور کائنات میں
غور و فکر کرنے کی صلاحیت

مادہ

انسان کی مادی بنیاد، مٹی سے تخلیق
(جسمانی وجود)

اخلاقی حِس

خیر اور شر کے درمیان تمیز کرنے
کی فطری صلاحیت (ضمیر)

حیات

مٹی اور نطفہ سے بنی حیات جو مادہ کو
متحرک رکھتی ہے (حیوانی وجود)

ارادہ و اختیار

عمل اور نیت کا انتخاب، شخصی
ذمہ داری کا بنیادی تصور

سید المجاذیب خواجہ نعمان نیئرؔ کلاچوی صوبہ خیبر پختونخواہ کی ایک دور اُفتادہ تحصیل کلاچی کے باسی ہیں۔ آپ ایک جامع العلوم شخصیت ہیں۔ آپ بیک وقت مذاہبِ عالم، علم الکلام و فلسفہ، شعر و اَدب، صحافت و بلاغت، معاشرت و سیاست، نفسیات و روحانیات اور رقص و موسیقی پر گہری گرفت رکھتے ہیں۔ آپ ایک طویل عرصے سے مسلسل گوشہ نشینی اختیار کئے ہوئے ہیں اور دریں اثناء علمی و تحقیقی کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ ماڈرن فلاسفی اور علمِ نفسیات پر آپ کا علمی کام اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں انٹرنیٹ پر ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ آپ چھ کتابوں "عشق کی سائنس"، "تصوف کی ڈکشنری"، "صراطِ دانش"، "سوزِ نہاں"، "قبیلہ نور احمد خیل" اور " Trek to Intellect " کے مصنف ہیں۔ علاوہ ازیں دیگر کئی مقالات و علمی شذرات کے بھی مؤلف و مصنف ہیں۔ زیرِ نظر مقالہ بھی آپ ہی کی علمی و تحقیقی جہد کا ماحصل ہے۔